یادیں، سید حامد کے علی گڑھ کی!

از پروفیسر پرویز طالب

علی گڑھ کی یادوں میں سب سے روشن چہرہ جس کو میں نے بنفسِ نفیس دیکھا، محسوس کیا اور تربیت کا ذریعہ بنا، وہ اوس وقت کے شیخ الجامعہ سید حامد صاحب کا ہے۔ جس سال میں علی گڑھ میں بحیثیت طالب علم داخل ہوا وہ اسی سال بحیثیت شیخ الجامعہ تشریف لائے۔ پہلا سال ہی خاصہ ہنگامہ خیز رہا۔ ایک مشہور پروفیسر کے بیان پر احتجاج ہوا جو زور پکڑتا گیا۔ اس احتجاج میں حتمی موڑ تب آیا جب ایک طالب علم ''آفتاب'' پولس کی گولی سے جاں بحق ہو گیا۔ حالات نازک ہوئے تو وائس چانسلر موصوف نے یونیورسٹی بند کرنے کا فیصلہ لیا۔ آفتاب ہوسٹل میں اپنے بڑے بھائی کے کمرے میں میرا قیام تھا۔ صبح ہوئی تو دیکھا کہ قطار در قطار سی۔ آر۔ پی۔ ایف کے جوان تعینات ہیں اور طلبہ کو ہاسٹل خالی کرنے کے احکامات جاری ہو چکے ہیں۔ یو. پی کے اطراف کے طلبہ کے لیے بسوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ ہم سب کو پروکٹر آفس سے ان بسوں میں سوار ہونا تھا اور اپنے اپنے گھروں کو کوچ کر جانا تھا۔ میرا ناپختہ ذہن گزشتہ دنوں گزرنے والے حالات سے نالاں تھا۔ سونے پر سہاگا یہ کہ اس وقت کے ایک مشہور سینئر طالب علم منظر شفیع بھی بس میں سوار تھے۔ وہ بھی سید حامد صاحب کے عتاب کے شکار تھے۔ سارا راستہ سید حامد مردہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے تمام ہوا۔ ذہن میں یہی تأثر غالب تھا کہ کیسا ظالم وائس چانسلر ہے۔

خیر سے یونیورسٹی دوبارہ کھل گئی۔ اور نسبتاً سکون سے چلی۔ تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ادبی، ثقافتی اور کھیل کود کی سرگرمیاں بھی عروج پر تھیں۔ اتر پردیش بورڈ کا طالب علم لسانی اعتبار سے ایک دقّت کا شکار رہتا ہے۔ ہندی میڈیم کا پڑھا ہوتا ہے، علی گڑھ آ کر اس سے وہ وابستگی نہیں رہتی۔ اردو میں شد بد اس پر منحصر رہتی ہے کہ گھر میں اس کے لیے ماحول کتنا ساز گار رہا ہے۔ انگریزی میں بھی استعداد محدود ہوتی ہے۔ میں اپنے شہر بجنور میں یو. پی بورڈ کا ٹاپر رہا تھا، اس لیے اپنے تشخص کا احساس کچھ زیادہ تھا۔ والدہ کی تربیت کا ثمرہ تھا کہ اشعار کا ذخیرہ میرے پاس خوب تھا۔ میں نے خیال کیا کہ اپنی پہچان بیت بازی کے میدان میں بنائی جائے۔ یہ فیصلہ خاصہ معقول رہا اور میں نے جلد ہی اس میں اپنی ایک پہچان بنالی۔

بات سید حامد صاحب کی ہو رہی تھی۔ میرے بڑے بھائی کے حلقۂ احباب کی ان کے یہاں رسائی ہوگئی تھی۔ خاص طور سے افضل بھائی (مرحوم سید محمد افضل، سابق رجسٹرار۔ اے۔ ایم۔ یو) سے ان کی خاص قربت تھی۔ اس کی وجہ ان کا ادبی ذوق اور اردو میں تقریر کی استعداد تھی۔ سید حامد اس صلاحیت کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اسی ضمن میں ایک ادبی پروگرام وی بی. لاج میں منعقد ہوا۔ جس میں انہوں نے اپنا یہ شعر پڑھا:

ایک دو زخم نہیں جسم ہے سارا چھلنی
درد بیچارہ پریشاں ہے کہاں سے اٹھے

اس شعر کا یونیورسٹی کے ادبی حلقے میں خاصہ چرچا رہا۔ تبھی سے یہ احساس پیدا ہوا کہ ایک دھڑکتا ہوا دل رکھتے ہیں۔ اور ان کے یہاں ایک سوز پایا جاتا ہے۔ انکے ظالم ہونے کا تأثر دھندھلانے لگا، مگر ختم نہیں ہوا تھا۔ اسی دوران ایک پروگرام آفتاب ہال کے کامن روم میں ہوا۔ جہاں انہوں نے اعلان کیا کہ یونیورسٹی اب نظم وضبط سے چلے گی۔ اس وقت ایک سینئر طالب علم ڈاکٹر علی امیر نے برجستہ کہا۔ جی جناب، نظم آپ کا اور ضبط ہمارا۔ سید حامد بھی اس جملے پر مسکرا کر رہ گئے۔ ان نرم گرم سرگرمیوں کے ساتھ ان کا دور اختتام پذیر ہوا۔ ان کی واپسی کو یومِ نجات کے طور پر منایا گیا۔ یونیورسٹی میں چراغاں کا اہتمام کیا گیا۔ اس ہال کے لیے باقاعدہ انعام تجویز ہوا جس کی سجاوٹ اور روشنی اس مبارک موقع پر عروج پر تھی۔ ممتاز ہاسٹل میں اس ضمن میں ایک کلچرل پروگرام بھی ہوا جس میں ایک ڈرامہ پیش کیا گیا جس میں ان کی اور ان سے منسلک اساتذہ کی کردار کشی اور تضحیک کی گئی۔ میں بھی ان پروگراموں میں تماشائی کی حیثیت سے شامل رہا۔ اور اپنے طور پر خوب محظوظ ہوا۔

اصغر گونڈوی کا ایک شعر ہے۔

لَو شمعِ حقیقت کی اپنی ہی جگہ پر ہے
فانوس کی گردش میں کیا کیا نظر آتا ہے

وہ کیا شخصیت تھی اور ہم نے اس کے ساتھ کیا کیا ناانصافیاں کیں۔ لیکن یہ بہت بعد میں سمجھ میں آیا۔ اس ضمن میں سب سے اہم کردار سید محمد اشرف صاحب کے ایک انٹرویو کا رہا۔ اشرف بھائی اس وقت یونیورسٹی کے ممتاز طالب علم تھے۔ وہ سِول سروسز میں اس وقت کامیاب ہو کر آئی۔ آر۔ ایس۔ کے لیے منتخب ہوئے تھے۔ جب بحیثیت کمشنر انکم ٹیکس، علی گڑھ میں ان کا تقرر ہوا تو آفتاب ہال میگزین میں ان کا ایک انٹرویو شائع ہوا۔ اس انٹرویو نے ذہن کے سارے دریچے کھول دیے۔ اپنی ناعاقبت اندیشی کا افسوس ہوا۔ آج بھی اس انٹرویو کے اُس اقتباس کو پڑھتا ہوں جس میں انہوں نے سید حامد صاحب کے سلسلے میں ایک واقعہ بیان کیا ہے، تو گلا رندھ جاتا ہے اور آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں۔ اس میگزین کے مدیر نے ان سے زمانۂ طالب علمی کے کسی خوش کن واقعہ کے بارے میں جو نصیحت آمیز ہو، سوال کیا۔ اس کے جواب میں اشرف صاحب نے طلبہ کا احتجاج کے حوالے سے ایک واقعے کی تفصیل بیان کی۔ تفصیل اشرف صاحب کی زبانی (کچھ اختصار کے ساتھ) تحریر کرتا ہوں:

''۱۹۸۰ء میں ایک پروفیسر صاحب کے بیان پر طلبہ نے احتجاج کیا اور وہ اس پیمانے کا تھا کہ شیخ الجامعہ کو یونیورسٹی بند کرنے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ وہ رات بہت سخت تھی۔ طلبہ وی۔ سی۔ لاج میں کیمپ لگائے ہوئے تھے۔ یونیورسٹی کے لیڈران کو علم ہوا کہ یونیورسٹی بند کرنے کا فیصلہ ہو رہا ہے۔ ٹرینیں پلیٹ فارم پر آ چکی ہیں۔ بسیں بلائی جا رہی ہیں۔ سی۔ آر۔ پی۔ ایف۔ بڑی تعداد میں پہنچ رہی ہے۔ اور وی۔ سی۔ لاج پر دھرنا دینے والے گرفتار ہونے والے ہیں۔ غالباً میں اس وقت سول سروس کا امتحان پاس کر چکا تھا۔ یونین کے صدر اور سکریٹری نے پی۔ وی۔ سی۔ لاج کی عمارت میں ایک ایمرجنسی میٹنگ طلب کی جس میں عاجز کے علاوہ کفیل احمد (سابق منیجر، دوا خانہ، اے۔ ایم۔ یو) نے یہ تجویز رکھی کے طلبہ کے مستقبل کے مفاد میں ہمیں فوراً اپنی تحریک واپس لے لینی چاہیے۔ کیوں کہ ہماری شکایت ان پروفیسر موصوف سے اسی قدر ہے کہ یونیورسٹی کے اندرونی معاملات کا پریس میں ذکر نہیں کرنا چاہیے تھا۔ یونین نے ہماری تجویز مان لی اور ہم دونوں سے گزارش کی کہ آپ وی۔ سی۔ سے مل کر انہیں یونیورسٹی بند کرنے سے باز رکھیں۔

''صورت حال یہ تھی کہ اگر وی۔ سی۔ کے پاس جاتے

ہیں تو تھوڑی دیر میں وہاں گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا چاہتا تھا۔ دوسرے یہ کہ طلبہ کے سامنے سے ہو کر وی.سی. کے پاس جانا ممکن نہیں تھا۔ کیوں کہ یونین کے چند ذمہ داران کے علاوہ سب کو علم بھی نہیں تھا کہ یونیورسٹی بند کرنے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ تردّد کا سبب ایک یہ بھی تھا کہ سید حامد کی سخت گیری کے کئی واقعات سن رکھے تھے۔ اس وقت کے ڈی۔ایس۔ ڈبلیو پروفیسر فصیح الحسن رضوی صاحب تھے۔ وہ ایک نیک دل اور بے خوف پروفیسر تھے۔ ہم لوگوں نے ان سے کہا کہ آپ وائس چانسلر صاحب سے ہماری ملاقات کروا دیجئے۔ انہوں نے وائس چانسلر کو اس کے لئے آمادہ کیا۔ ہم دونوں وی۔سی۔ لاج کے پیچھے کی دیوار کود کر اندر لاج میں پہنچ گئے۔ حامد صاحب ہمارا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئے۔ ہم اور کفیل پہنچتے ہی تقریر کرنے لگے۔ ایک رکتا، دوسرا بولتا۔ وہ خاموشی سے سنتے رہے۔ دوران گفتگو ہم لوگوں نے ایک بات یہ کہی کہ ہم سب کی دشمنی مول لے کر آئے ہیں، مگر طلبہ سے یہ فیصلہ کرانے میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ تحریک ابھی واپس لے لی جائے گی۔ آپ یونیورسٹی بند نہ کریں۔ حامد صاحب آبدیدہ ہو گئے۔ ہم بھی انہیں افسردہ دیکھ کر آبدیدہ ہو گئے۔ میں نے آخری تیر چھوڑا جس کا نشانہ میرے اندازے کے مطابق ان پر خطا نہیں ہو سکتا تھا۔ میں سول سروس کے امتحان میں یونیورسٹی سے منتخب ہونے والا واحد امیدوار ہوں۔ اگر گرفتار ہو گیا تو سب ملیا میٹ ہو جائے گا۔ اب آپ جو چاہیں فیصلہ کریں۔ سید حامد کچھ دیر کے بعد گویا ہوئے۔ آواز میں ٹھہراؤ تھا۔ یونیورسٹی بند کرنے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اس پر عمل ہوگا۔ آپ دونوں کو دیکھ کر صرف ایک ہی بات کہتا ہوں کہ:

یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یارب میرے خاکستر میں تھی

''آپ گرفتار نہ ہوں اس کا انتظام یہ ہے کہ آپ اسی کمرے میں قیام کریں۔ یونیورسٹی بند کرنا اس لیے ضروری ہے کہ بہت سے غیر طالب علم اس تحریک میں شامل ہو گئے ہیں۔ جن کو نکالنے کا میں پکا ارادہ کر چکا ہوں۔ اس تحریک کے پیچھے صرف معصوم طالب علم ہی نہیں ہیں، بلکہ بہت سے گرگِ باراں دیدہ بھی اس تحریک میں شامل ہو چکے ہیں۔ جن کا آپ کو علم نہیں ہے۔ آپ خدارا مجھے ظالم نہ سمجھیں۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔ آپ وی۔سی۔ لاج سے باہر نہ نکلیں۔ آپ گرفتار ہو جائیں گے۔ جس کا مجھے بے حد افسوس ہوگا، کہ آپ اتنا جوکھم اٹھا کر ایک کارِ خیر کے لیے اس عالم میں آئے اور میں آپ کو گرفتاری سے نہ بچا سکا۔

''ہم اس زمانے میں یونیورسٹی کے بہترین مقررین میں شمار کیے جاتے تھے۔ کمرہ کپوں اور ٹرافیوں سے بھرا رہتا تھا۔ ان سب کو یاد کر کے ہم نے ایک فی البدیہہ تقریر تیار کی جس کا مفہوم تھا کہ ہم بزدل نہیں کہ آپ کے ایوان میں چھپے بیٹھے رہیں اور کل ساری یونیورسٹی کے طلبہ کی گالیاں کھائیں۔ آپ کی حق پرستی کی داد دیتے ہیں مگر طلبہ سے اپنی وفا پرستی کا طعنہ نہیں برداشت کر سکیں گے۔ چاہے سول سروس کا جو حشر ہو۔ خدا حافظ۔ وہ مغموم آنکھوں سے ہمیں باہر گرفتاری کے لئے جاتا دیکھتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد کلکٹر اور ایس۔ایس۔پی۔ ڈھالیں لیے فورس کے ساتھ آئے اور طلبہ کو گرفتار کر لیا۔ مجھے دیکھ کر بولے کہ تم نے سول سروس کا امتحان پاس کر لیا ہے۔ چپ چاپ جا کر میری گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ میں نے کہا کہ جب میں اپنے وی۔سی۔ کے کمرے میں نہیں چھپا تو آپ کی جیپ میں کیا چھپوں گا۔ نتیجہ یہ کہ میں بھی گرفتار کر لیا گیا۔ اور بڑی جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ تین دن بعد ہمیں رہا کرنے کی کارروائی ہوئی جس میں بونڈ بھرنا تھا۔ ہم نے جیل میں بھوک ہڑتال جیسا ماحول پیدا کر دیا۔ آخر کار وزیر اعلیٰ نے ہمیں غیر مشروط چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ ہم لوگ رہا ہو کر آ گئے۔ یونیورسٹی بند ہو چکی تھی۔ قصہ مختصر یہ کہ میں بعد میں انٹرویو میں کامیاب ہوا۔ اس کے بعد ایک فارم بھرنا تھا، جس میں یہ لکھنا ہوتا ہے کہ امیدوار کبھی جیل نہیں گیا ہے۔ ایک دو لوگوں نے مشورہ دیا کہ غلط بیانی سے کام لو۔ دل نے گوارہ نہیں کیا۔ میں نے صاف صاف لکھ دیا کہ طلبہ کے احتجاج کے سلسلے میں میری گرفتاری وی۔سی۔ لاج سے عمل میں آئی تھی۔

میرا تقرر نامہ نہیں آیا۔ بہت تردّد تھا۔ جانتا تھا کہ گرفتاری رنگ لائے گی۔ ایک دن دل کڑا کر کے دلّی میں منسٹری آف ہوم کے ڈپارٹمنٹ آف پرسنیل میں پہنچا۔ متعلق افسر ایک سردار جی تھے۔ ان سے اپنا تعارف کرایا۔ چمک کر بولے۔ احتجاج آپ کرتے ہیں۔ گرفتار پولس کرتی ہے۔ جیلر جیل میں ڈالتا ہے، اور ڈانٹ ہم کھاتے ہیں۔ میں نے پوچھا کس کی ڈانٹ۔ کہنے لگے اور کون؟ سید حامد صاحب ڈانٹ کر گئے ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ اشرف نے کسی بھی جگہ غلط بیانی سے کام نہیں لیا۔ اور کسی جگہ کوئی غلط کام نہیں کیا۔ وہ چاہتے تو میرے یہاں چھپ سکتے تھے۔ چاہتے تو ایس۔ایس۔پی۔ کی گاڑی میں چھپ سکتے تھے۔ مگر یہ ان کی غیرت نے گوارہ نہیں کیا۔ کیا اب میری غیرت یہ گوارہ کرے گی کہ ان کی سروس کے معاملات میں کوئی رکاوٹ آئے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس سال یونیورسٹی سے کامیاب ہونے والے وہ واحد امیدوار ہیں۔ فوراً ان کا اپوائنٹ مینٹ لیٹر دیجئے۔ میں تصدیق کرتا ہوں کہ وہ بالکل بے خطا ہیں، اور میں یہ تصدیق بحیثیت وی.سی. کرتا ہوں۔

''میں ڈبڈبائی آنکھوں سے علی گڑھ آیا، وی۔سی۔ لاج گیا۔ باہر ہی مل گئے۔ میں کچھ کہنا چاہتا تھا، مگر مجھے روک دیا اور کہا کہ آپ سول سروس میں کامیاب ہوئے ہیں، آپ کا وی۔سی۔ اس خوشی میں رات کا کھانا آپ کے ساتھ کھانا چاہتا ہے۔

''رات کو میں نے سید حامد صاحب اور انکی بیگم کے ساتھ ان کے گھر سادہ لیکن بہت خوش ذائقہ کھانا کھایا۔ وہ اصرار کر کے مجھے کھلاتے رہے۔ پھر دروازے تک چھوڑنے آئے۔ اور رخصت کرتے وقت مجھے سینے سے لگا لیا۔ میں دیر تک ان کے سینے سے لگا رہا۔ اس واقعے کے ۱۵ رسال بعد میرے افسانوں کا مجموعہ ''ڈار سے بچھڑے'' کا اجرا غالب اکیڈمی، دہلی میں ہوا۔ وہاں وہ تشریف لائے۔ میں نے خیال کیا کہ سب بھول بھال گئے ہوں گے، مگر جب تقریر شروع کی تو سارے واقعات من و عن جلسے میں بیان کیے صرف وہ حصہ بیان نہیں کیا جو ان کے ذریعہ ہوم منسٹری میں ادا کیا گیا تھا۔ اور نہ اس کا ذکر کیا کہ انہوں نے مجھے گھر بلا کر اس محبت سے کھانا کھلایا تھا۔ علی گڑھ سے دسیوں خوش کن یادیں وابستہ ہیں۔ مگر عبرت اور نصیحت، شفقت اور محبت، انسانیت اور شرافت کا جو درس اس واقعے میں ہے وہ اور کسی واقعے میں نہیں۔ آج بھی مجھے اور کفیل کو اس مردِ آہن کی آبدیدہ آنکھیں یاد ہیں۔''

اسی احتجاج کے سلسلے میں ایک اہم خبر مجھے تاریخ کے ممتاز استاد پروفیسر عشرت عالم نے فراہم کی۔ عشرت بھائی کے والد رفیق عالم صاحب بہار صوبے کے فعال اور سرکردہ سیاست دان تھے۔ اس وقت کی وزیر اعظم اندرا گاندھی سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ عشرت صاحب کا بیان ہے کہ میں اپنے والد کے ہمراہ اندرا گاندھی کے یہاں حاضر تھا، سید حامد صاحب بھی ان سے ملاقات کے لیے وہاں تشریف لائے۔ طالب علم آفتاب جاں بحق ہو چکا تھا۔ سید حامد صاحب پر اس کا گہرا اثر تھا۔ وہ اپنے استعفٰی کے ساتھ گئے تھے۔ انہوں نے اس سانحے کی اخلاقی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے اپنے استعفٰی کی خواہش ظاہر کی۔ اندرا گاندھی خاموشی سے ان کا بیان سنتی رہیں۔ ایسا محسوس ہوا کہ وہ اپنی فائلیں دیکھنے میں مصروف ہیں۔ کچھ دیر بعد رفیق عالم صاحب سے مخاطب ہوئیں اور فرمایا کہ عالم صاحب جو معیار حامد صاحب پیش کر رہے ہیں اس کے لحاظ سے تو مجھے دن میں کئی بار استعفٰی دینا ہوگا۔ آپ انہیں سمجھائیے اور ایسا کرنے سے باز رکھیے۔ انہیں یونیورسٹی کو راہِ راست پر لانے کو بھیجا گیا ہے اور اس کام کو پورا کیے بغیر ان کی واپسی ممکن نہیں۔ پھر اپنے دفتری عملے کے اہم رکن جناب پی۔سی۔ الیگزنڈر کو طلب کیا اور انہیں ہدایت دی کہ سید حامد میری ہاٹ لائن پر رہیں گے۔ انہیں تمام سہولیات فراہم کی جائیں۔ جب ضرورت ہو یہ مجھ سے براہِ راست رابطہ کر سکتے ہیں۔ مگر مقصد حاصل کیے بغیر علی گڑھ سے واپس نہیں آ سکتے۔

اور واقعہ ہے کہ سید حامد ایک نئے عزم کے ساتھ علی گڑھ

واپس آئے اور ان شر پسند اور خود غرض عناصر سے یونیورسٹی کو پاک کیا جو اس ادارے کی فلاح کا چولا اوڑھ کر اپنی مفاد پرستی میں مصروف تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام آسان نہ تھا۔ طلبہ کا ایک گروہ وہ تھا جو سیاسی عزائم رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ ایسے طلبہ بھی تھے جو ایک مدت سے ہاسٹلوں میں کمروں پر قابض تھے، جس سے مستحق طلبہ کی حق تلفی ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ وہ اساتذہ تھے جو چھٹی کی مدت گزر جانے کے بعد بھی بیرونِ ملک قیام کی خواہش رکھتے تھے اور یہ بھی چاہتے تھے کہ یہاں کی ملازمت پر کوئی ضرب نہ آئے۔ یعنی دونوں ہاتھوں میں لڈّو رہیں۔ بقول سید حامد صاحب کے، اگر باڑھ ہی کھیت کو کھانے لگے، تو فصل کاٹنے والے خالی ہاتھ ہی جائیں گے۔ سید حامد صاحب ان سبھی مفاد پرستوں سے سینہ سپر ہو گئے۔ ایسے اساتذہ کو جو چھٹی کی مدت گذر جانے کے بعد بھی اپنی یونیورسٹی کی ملازمت پر واپس نہیں آئے تھے، الٹی میٹم دیا جا چکا تھا۔ طلبہ کا ہاسٹلوں میں کورس کی مدت گزر جانے کے بعد قیام ناممکن ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ جو ان سخت فیصلوں کی زد میں آئے تھے وہ خوش نہیں ہو سکتے تھے۔ ایسا سخت گیر وائس چانسلر ان کو ایک آنکھ نہیں بھا رہا تھا۔ سید حامد کو لگا تار شورشوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ مخالفت کئی موقعوں پر حدوں سے تجاوز بھی کرتی تھی اور اس میں ایسے الزامات بھی لگائے جاتے جو قطعی غیر مناسب تھے۔ میں نے احتجاج کے دوران ایک کارٹون ایسا بھی دیکھا جس میں سید حامد سجدے میں ہیں اور سامنے اندرا گاندھی کھڑی ہیں اور علامہ اقبال کا مصرعہ اس کارٹون پر درج ہے کہ:

ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

ایک اور پوسٹر میں درج تھا کہ سید حامد نماز کے لئے جو نیت کر رہے ہیں، نیت کچھ یوں تھی ''نیت کرتا ہوں میں حکومت کو خوش کرنے کی اور یونیورسٹی کو تباہ کرنے کی، مونہہ میرا اتر نگے کی طرف، جے ہند''۔ یہ سید حامد ہی کا عزم اور ارادہ کی پختگی تھی کہ وہ ان تمام دل شکن مخالفتوں کے باوجود ثابت قدم رہے۔ اور اپنا مقصد سامنے رکھا۔ ان کے اس عزم کا نتیجہ تھا کہ جب ان کا دور اختتام پذیر ہوا تو یونیورسٹی میں قانون کی بالا دستی تھی۔ معاملات ضابطے کے پابند تھے۔ اس کا اعتراف ان کے جانشین سید ہاشم علی صاحب بھی کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے جو کام میں عثمانیہ یونیورسٹی میں کر کے آیا وہ سید صاحب نے یہاں کیا، جس سے میرے لیے راہ ہموار ہو گئی۔

اس ضمن میں یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ سید حامد کا مقصد یہ نہیں تھا کہ آنکھ بند کر کے قانون کا اطلاق ہو، بلکہ اس کی اصل روح کو سامنے رکھ کر قانون نافذ کیا جائے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ کا ذکر مناسب ہوگا۔ جو میرے استاد پروفیسر جاوید اختر صاحب کی طالب علمی کے زمانے میں پیش آیا۔ جاوید صاحب نے ۱۹۷۹ء میں بی.کام میں پہلا مقام حاصل کیا اور مقابلے کا امتحان پاس کر ایم۔ بی۔ اے میں داخلہ لیا۔ بی۔ کام میں پہلا مقام حاصل کرنے والے طالب علم کو ایم۔ کام میں ایک میرٹ اسکالرشپ کا مستحق سمجھا جاتا تھا۔ مگر انہیں اس اکرام سے محروم رکھا گیا۔ وجہ یہ پیش کی گئی کہ اسکالرشپ کے لیے طالب علم کا ایم۔ کام میں ہونا ضروری ہے۔ ان کی تمام عرض داشتیں اس قانون کے حوالے سے مسترد کر دی گئیں۔ اسی دوران سید حامد نے بحیثیت وائس چانسلر ذمہ داری قبول کی۔ ایک آخری کوشش کے طور پر انہوں نے وائس چانسلر سے ملاقات کا ارادہ کیا۔ ان کا بیان ہے کہ میں نے جب ان کے یہاں ملاقات کے لیے درخواست بھیجی تو اس پر لکھ دیا 'جاوید اختر، بی۔ کام (گولڈ میڈلسٹ)۔ فوراً رسائی حاصل ہوئی، مسئلہ غور سے سنا پھر مشورہ دیا کہ آپ سول سروس کی تیاری کریں۔ یہ کام کوئی مشکل نہیں۔ پھر اس معاملے سے متعلق اسسٹنٹ رجسٹرار سید احمد حسین صاحب کو طلب کیا۔ امید کے مطابق انہوں نے عذر پیش کیا اور فرمایا کہ 'سر، آرڈیننس کے مطابق اسکالرشپ کا حق دار ایم۔ کام کا طالب علم ہوتا ہے نہ کہ ایم۔ بی۔ اے کا'۔ سید حامد صاحب نے جاوید صاحب کی جانب ایسے دیکھا جیسے وہ ان سے مزید وضاحت چاہتے ہوں۔ انہوں نے برجستہ کہا کہ سر ایم.کام کے مقابلے، ایم. بی. اے میں داخلہ زیادہ مشکل ہے۔ میں نے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے، کیا مجھے اس کی یہ سزا ملے گی۔ دوسرے یہ کہ اگر بی.کام کا ٹاپر ایم.کام میں داخلہ نہیں لے گا تو یہ اسکالرشپ پھر کس کو ملے گی۔ اس کے جواب میں احمد حسین صاحب بس یہی دلیل پیش کر پائے کہ 'Rule is Rule, Sir'۔ اس پر سید حامد صاحب نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے انہیں ہدایت دی کہ آپ ''قانون میں تبدیلی کے لیے فائل تیار کیجئے۔ یہ اسکالرشپ انہی کو ملنی چاہیے''۔ جاوید صاحب سے ایک بار پھر مخاطب ہوئے، اور سول سروس کی تیاری کی تاکید کر کے جانے کی اجازت دی۔ ملاقات کا اثر یہ ہوا کہ ایم۔ بی۔ اے کے لیے ایک مزید اسکالرشپ کا مشورہ اکیڈمک کاؤنسل نے قبول کیا۔ ان کا پیغام صاف تھا کہ قانون کے الفاظ پر دھیان دینے کے بجائے اس کی روح کو سمجھنا ضروری ہے۔

ان کی ثابت قدمی اور استقلال کا اندازہ بحیثیت وائس چانسلر ان کے یہاں قیام کے آخری دن کے معمول سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس کے راوی سلمان جعفری صاحب ہیں۔ سلمان صاحب یونیورسٹی کے مایۂ ناز اولڈ بوائے ہیں۔ انہوں نے ایک کامیاب پی۔ ایم۔ سی۔ کی داغ بیل ڈالی ہے، جو بڑے بلڈنگ پروجیکٹس کرنے کی استعداد رکھتی ہے۔ ان کا ہمارے شعبۂ بزنس مینجمینٹ کی نئی عمارت کی تکمیل میں بھی کلیدی کردار رہا ہے۔ اس وقت وہ انجینئرنگ کے طالبِ علم تھے اور یونیورسٹی کی ہاکی ٹیم کے کپتان تھے۔ اس تعلق سے سید حامد انہیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ ان کی اس تعلق سے وی.سی. لاج میں رسائی تھی۔ انہوں نے ارادہ کیا کہ صبح روانگی کے وقت انہیں رخصت کرنے جاؤں گا۔ سید حامد کا عام طور سے معمول تھا کہ وہ دیر رات تک کام میں مصروف رہتے۔ اسی میں کبھی میز پر سر رکھ لیتے تو آنکھ لگ جاتی۔ ایسے میں ان کے عملے کے افراد انہیں ان کی آرام گاہ تک پہنچا دیتے۔ پھر صبح ۸؍ بجے تک اپنے روزمرّہ کے معاملات کے لیے چاق چوبند ہو جاتے۔ اسی معمول کے پیشِ نظر سلمان جعفری صاحب ۸؍ بجے وی۔ سی۔ لاج پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ وہ جا چکے ہیں۔ عملے کے اہم رکن عقیل احمد صاحب نے گوش گزار کیا کہ سید حامد صاحب رات بھر کرسی میز پر بیٹھے کام کرتے رہے، ساری رات یہاں کا کام ختم کیا۔ پھر فجر کی نماز کا وقت ہو گیا تو نماز پڑھی۔ عملے کے افراد سے ایک چائے اور دو ٹوسٹ کی فرمائش کی اور اسے نوش کرنے کے بعد دہلی کے لیے روانہ ہو گئے۔

تو یہ تھا وہ قوم کا محسن جس کی اس انداز سے علی گڑھ سے رخصتی ہوئی۔ اس پر الزام تھا کہ یہ اعلیٰ سرکاری عہدوں کا متمنی ہے اور اپنے دہلی کے آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے یہاں زیادتیاں کر رہا ہے۔ اللہ نے طویل عمر سے نوازا۔ یہاں سے جانے کے بعد اپنی باقی مدت قوم کی تعلیمی پستی دور کرنے کے لیے وقف کر دی۔ معتبر ذرائع سے علم ہوا کہ انہیں دو بار اعلیٰ سرکاری عہدوں کی پیش کش کی گئی مگر انہوں نے معذرت کی اور اپنا سارا وقت جامعہ ہمدرد، ہمدرد کوچنگ سینٹر اور تعلیمی کارواں کی سرگرمیوں میں صرف کیا۔ ایک بار سرکاری کام سے جڑے تو اس کا تعلق بھی قوم کی فلاح و بہبود سے ہی تھا یعنی سچر کمیٹی کے رکن کے فرائض انجام دیے۔ سید ظفر محمود صاحب کا بیان ہے کہ جسٹس راجیند ر سچر اُن کے مشوروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس رپورٹ کے مرتب ہونے میں ان کا اہم کردار رہا۔

سید حامد پر سخت گیر ہونے کا الزام تھا۔ تقریر میں ان کے خلاف جو باتیں کی جاتیں ان میں ان کی سخت گیری کو ضدی ہونے سے تعبیر کیا جاتا، ان کو مشورہ دیا جاتا کہ انہیں والدین کا کردار ادا کرنا چاہیے۔ اس کا جواب وہ یوں دیتے کہ مجھ سے ایک باپ کی شفقت کی توقع رکھی جائے جو اولاد پر سخت نگاہ رکھتا ہے مگر اس کے پیچھے جو جذبہ کارفرما ہوتا ہے، وہ اولاد کی بہتری کا ہی ہے۔ وہ سخت گیر ضرور تھے مگر ضدی نہیں۔ اس کا اندازہ مسلمانوں کے ریزرویشن کے معاملے میں ان کے خیالات سے کیا جا سکتا ہے۔ بحیثیت وائس چانسلر علی گڑھ میں اپنے قیام کے دوران وہ مسلمانوں کے لیے ریزرویشن کے حق میں نہیں تھے۔ ہمارے استاد مرحوم عزیز صاحب سے اس سلسلے میں ان سے مذاکرہ ہوا تو انہوں نے سوال کیا کہ ہم اپنی قوم کو بیساکھی پر کب

تک چلائیں گے۔عزیر صاحب نے برجستہ جواب دیا کہ جب تک قوم کی ٹانگیں مضبوط نہ ہو جائیں۔اس جواب سے وہ کچھ مطمئن نظر نہ آئے۔وہی شخص جب تعلیمی کارواں کے سلسلے میں شہروں شہروں سفر کرتا ہے اور زمینی سطح پر مسلمانوں کے اقتصادی حالات کا تجزیہ کرتا ہے تو اس کے خیالات میں تبدیلی آتی ہے۔ وہ اپنا موقف تبدیل کر لیتے ہیں اور مسلمانوں کے ریزرویشن کے حمایتی ہو جاتے ہیں۔ ان کی یہ اخلاقی جرأت اور فکری ایمانداری تھی۔اپنے دیرینہ موقف کو تبدیل کرنے میں انہیں ذرا تردّد نہ ہوا۔

ان کے، علی گڑھ اور قوم سے اس حد درجہ لگاؤ کی کیا وجہ تھی۔کیوں انہوں نے اس کی بہتری کے لیے اپنی ذات کو وقف کر دیا۔ساتھ میں اپنوں کی زیادتیاں بھی برداشت کیں۔ در اصل علی گڑھ کا ایک پرانا طالب علم ہی اس تعلق کو سمجھ سکتا ہے۔ اپنے ایک مضمون ''چالیس سال پہلے'' میں انہوں نے اپنے طالب علمی کے زمانے کو یاد کیا ہے۔ یہ مضمون آفتاب ہال میگزین میں ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا ہے۔اپنے دور کے فعال اساتذہ کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے اور مضمون کا اختتام اس انداز سے کیا ہے:

''یہ سطور ضائع نہ ہوں اگر موجودہ اساتذہ ان بزرگوں سے ہمت، ریاضت، ایثار اور ہمدردی کا سبق حاصل کریں۔ علی گڑھ کے معیارِ تعلیم کو بلند کریں۔اس کی ملک گیر حیثیت کو بحال کریں اور طلبہ میں علم کی جستجو، حوصلہ، عزتِ نفس، نظم وضبط، فخر اور خوش اطواری کو فروغ دیں، کہ بقا کے لیے آخری امید اب یہی ہے۔''

اسی مضمون میں انہوں نے قوم کے یونیورسٹی سے والہانہ لگاؤ کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کا احساس انہیں اے۔ایم۔یو۔ ہاکی ٹیم کے رکن کی حیثیت سے ہوا۔ ہاکی ٹیم کا سفر ملک گیر سطح پر شہروں شہروں ہوتا تھا۔فقیرے خان ویسے تو محض گیمس سرونٹ تھے مگر ٹیم کے اصل کرتا دھرتا وہی تھے۔انہوں نے یہ ذمہ داری ۴۰ر سال نبھائی۔فقیرے خان کے حوالے سے سید حامد رقم طراز ہیں:

''معرکے کے میچوں میں بارہا ایسا ہوا کہ ایک رات پہلے نہ صرف بے شمار عام مسلمان، بلکہ بہت سے متقی پرہیزگار بزرگ جنہیں ہاکی سے کوئی دلچسپی نہ تھی، وہ بھی ساری رات مصلّے پر گزارتے، دعا خدا کی مخلوق اور مسلمانوں کی فلاح کے لیے نہ ہوتی، نہ اپنی بخشش کے لیے ہوتی، دعا صرف یہ ہوتی کہ پروردگار علی گڑھ کی ٹیم کو جتا دے۔ رو رو کر گڑگڑا گڑگڑا کر باری تعالیٰ سے یہ دعا مانگتے ہوئے ان بزرگوں کی داڑھیاں تر ہو جاتیں۔ اللہ اللہ علی گڑھ سے کیسی وابستگی مسلمانوں کو تھی۔اور تھی کیوں، ہے، اب بھی ہے، اب بھی وابستگی میں کمی نہیں آئی ہے۔کوئی ان کی محبت کا مستحق ہو جائے تو نہ معلوم کتنے مراحل طے ہو جائیں، ادبار کی گھٹا چھٹ جائے اور ترقی کی بے شمار راہیں ہم پر کھل جائیں۔''

اپنے ایک اور مضمون بعنوان ''بیس سال بعد'' میں، جو علی گڑھ میگزین کے ۹۶-۱۹۹۵ء کے شمارے میں شائع ہوا، انہوں نے اپنی دو وابستگیوں، بحیثیت طالب علم اور پھر بحیثیت سربراہ، کا موازنہ کیا ہے۔اپنی دوسری وابستگی میں کی گئی کاوشوں کا بیان کچھ اس انداز سے کیا ہے:

''پہلی بار علی گڑھ نے مجھے سب کچھ دیا اور میں اسے کچھ نہ دے سکا۔ یونیورسٹی کے احسانات سے رواں رواں زیر بار ہے، دوسری بار یونیورسٹی نے مجھے کچھ نہیں دیا، اور دیتی بھی کیا، وہ تو سب کچھ مجھے پہلے ہی دے چکی تھی۔ یہ فیصلہ کہ میں اپنی مادرِ علمی کا احسان چکا سکا، یا اس کے لیے کچھ کر سکا شاید کبھی نہ ہو سکے گا۔ میں نے کوئی کارِ نمایاں کیا بھی تو نہیں۔ میں نے تو صرف اتنا کیا کہ یونیورسٹی کی دیواروں میں جو کجی آ گئی تھی، اسے پیٹھ لگا کر درست کر دیا۔شاید میں نے اسے سید والا گہر کے عزائم پھر یاد دلائے۔''

یہ سادگی اور انکساری تھی ان کی اپنے کارِ نمایاں کے سلسلے میں۔جسٹس کاٹجو نے ان کے انتقال پر، جو ۲۹ر دسمبر ۲۰۱۱ء کو ہوا، ایک مضمون تحریر کیا تھا جس کا عنوان تھا ''Sir Syed Built the University, Syed Hamid Saved it''

ان کے یونیورسٹی سے والہانہ لگاؤ کا ذکر مرحوم سید محمد افضل نے بھی کیا ہے۔انہوں نے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ جب وہ جامعہ ملیہ کے رجسٹرار تھے، سید حامد صاحب کو ایک فنکشن میں مدعو کیا گیا۔ان کو لانے کا کام انہوں نے اپنے ذمہ لیا۔مقصد تھا کہ ان کے ساتھ کچھ لمحات گزارنے کا موقع نصیب ہوگا۔سفر کے دوران ان سے دریافت کیا کہ آپ کی علی گڑھ نے وہ قدر نہ کی جو آپ کا حق تھا۔لیکن آج بھی علی گڑھ آپ کی رگوں میں دوڑتا ہے۔اس کی کیا وجہ ہے؟ سید حامد صاحب خاموش رہے۔کار کے ڈیک میں حبیب ولی محمد کی گائی ایک غزل چل رہی تھی ؎

آوارگی کو رسمِ جوانی سمجھ کے ہم
ڈھیروں شراب پی گئے پانی سمجھ کے ہم

پھر گلوکار نے یہ اشعار ادا کیے ؎

برسوں جبیں پہ زخم سجائے پھرا کیے
اک بے وفا گلی کی نشانی سمجھ کے ہم
اے منزلِ حیات یہ کانٹے بھی کر قبول
لائے ہیں راستے کی نشانی سمجھ کے ہم
کچھ ایسی دلکشی تھی جہانِ خراب میں
جنت بھی چھوڑ آئے پرانی سمجھ کے ہم

سید حامد مغموم ہو گئے۔افضل بھائی کی جانب نم آنکھوں سے دیکھا۔افضل بھائی کو اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا۔

افضل بھائی کا بیان ہے کہ اس دن ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کسی نے ان کے دل کے سوتے کھول دیے ہوں۔ایسی تقریر کی کہ سامعین عش عش کر اٹھے۔ایک ایسا جملہ بھی ادا کیا جو سنہرے حروف میں لکھنے کے لائق ہے۔طلبہ سے مخاطب ہو کر نصیحت کی کہ ''کبھی غصے میں کوئی فیصلہ اور خوشی میں کوئی وعدہ مت کرنا''۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

ان کا دل قوم کی بہبودی کے لیے دھڑکتا تھا۔ہر عہدہ جس کو انہوں نے سرفراز کیا، وہ ان کی پہچان نہ تھی، بلکہ قوم کے درد کے درمان کا ذریعہ تھا۔وہ ایسے سرپرست تھے جو ہر وقت اپنے خردوں کی اصلاح اور کامیابی کے لیے سرگرم عمل رہے۔ یہاں تقریر کے دوران طلبہ کو یہ بھی نصیحت کی کہ ''جو طالب علم ۱۵ر سے ۲۵ر سال کی عمر میں خون پسینہ نہیں بہاتا وہ زندگی بھر آنسو بہاتا ہے۔'' میرے چھوٹے بھائی کا قیام ہمدرد اسٹڈی سرکل میں رہا۔اس کا بیان ہے جب سید حامد صاحب تشریف لاتے اور مقابلہ جاتی امتحانوں کی تیاری میں مصروف طلبہ سے مخاطب ہوتے تو کئی دن تک اس کا اثر رہتا اور ہم لوگ نئے عزم سے اپنی تیاریوں میں مصروف ہو جاتے۔

آج بھی جو مٹھی بھر اجالا ملک گیر سطح پر سول سروسز میں نظر آتا ہے وہ انہی کی کاوشوں کا ثمرہ ہے۔اللہ انہیں غریقِ رحمت کرے۔ان کے درجات بلند فرمائے۔اور ہمیں اپنے محسنوں کو وقت سے پہچاننے کی توفیق دے۔ہم ان کے پیچھے نہ پڑ جائیں بلکہ ان کے پیچھے چلیں اور سچی تقلید کریں۔یہ بھی عین مناسب ہوگا کہ ان کے نامکمل خوابوں کی تکمیل کی تدبیریں کریں۔مضمون کا اختتام پروین شاکر کے ان اشعار پر کرتا ہوں ؎

زمیں کی گود میں سر رکھ کے سو گئے آخر
تمہارے عشق میں کتنے نڈھال تھے ہم بھی
ہم عکس عکس بکھرتے رہے اسی دھن میں
کہ زندگی میں کبھی لا زوال تھے ہم بھی

☆☆☆

Justice K. Subbarao

ex- Chief Justice, Supreme Court of India (1966-1967) speaks:
Unveiling the portrait of

JUSTICE SYED MAHMOOD

Mr. Chief Justice, distinguished friends from Russia, Malaysia and Nepal, distinguished guests, ladies and gentlemen-

I deem it an honour to unveil the portrait of one of the greatest Judges that our country has produced, Mr. Justice Mahmood. He had a short span of life. He was born in the year 1850 and passed away in 1903, i. e. he was barely 53 when he reached his end. He was the son of Sir Syed Ahmad Khan and was a Bar-at-Law. In 1879, he was appointed a District Judge at Rae Bareli and within three years thereafter he was elevated to the High Court Bench as an officiating Judge at an early age of 32. After reverting to the Bar, he was again made a Judge of the High Court permanently in the year 1886. He was the first Indian Judge to be appointed to the Allahabad High Court. But a person's impact on the world does not always depend upon his longevity. His short life reflected his concentrated effort in the judicial field. Though he died young, he left an indelible mark in the field of law.

All details of his personal life are not available; but the judgments he left, reveal the characteristics of his robust mind.

He was a man of courage, true to his convictions, and of independent mind. These traits are the necessary ingredients of a judicial mind; without them a person is a Judge only in name. The comparative prominence of the said characteristics demarcates one Judge from another. Mr. Justice Mahmood possessed them in full abundance. His dissenting judgments on important points show the man. Dissenting for dissension's sake may be bad, for it is only the result of an inferiority complex; but a dissent based on conviction and expressed with humility with the consciousness of the finiteness of the human mind is an appeal to the brooding sense of the posterity; they are the musings of a man born before the times with a capacity to look into the future. They will contribute to the jurisprudence of our country. They may have the approval of the future generations. Indeed, many of the dissenting judgments of Mr. Justice Mahmood had the approving seal of his successors.

He was a man of vision and philosophy of his own. Rule of law to him was not an instrument of tyranny, but was the soothing touch to the inflicted and oppressed. Whether in the matter of construction of a provision of a statute or in elucidating a doctrine of Mohammedan Law, he did not adopt a wooden attitude but evolved principles to guide the future. To him the rule of law was a way of life.

His judgments are masterly expositions on the different subjects dealt with by him; they reflect research, scholarship, hard work and thoroughness in detail. Some of his judgments hold the field even now, though a century has passed by since they were delivered. Some achieve reputation when they are alive by power and sycophancy, some after they die; and only a few are respected both by the contemporaries and by posterity. Mr. Justice Mahmood was one of those few; and the public esteem which he enjoyed during his lifetime has not abated but indeed has cast a halo around him. He was one of the typical Judges of our country who brought about synthesis between ancient Hindu and Mohammedan Laws and the Common law imported directly or through statutes from England. His dissenting judgments expounding principles of natural justice-a man who asserts a right has a right to be head evolving the concept of property-it includes the equity of redemption and laying down the doctrine – procedural laws are subservient to substantive laws – reflect his equitable and balanced approach to the legal problems. His judgments propounding that on the death of a Mohammedan intestate, his estate devolved on his heir, notwithstanding the existence of debts, that an offspring of adultery could not be made legitimate by acknowledgment of the putative father, and that the law of preemption was not a personal right, but was a right of substitution, are masterpieces of erudition and products of analytical mind. His exposition of the doctrine of salvage, and the extension of it both to the perils of

sea and perils of land discloses an original mind.

These are only a few out of the many illuminating judgments of the learned Judge. Whether it was Hindu law or Mohammedan law, whether it was procedural law or substantive law, whether the case involved evolution of new principles or a re-statement of accepted ones, his judgments are master pieces of scholarship, erudition and clarity.

Justice Muthuswamy Ayyar of the Madras High Court was a contemporary of Justice Mahmood. They shared many common traits; both of them were the first Indians appointed as Judges of their respective High Courts; both were learned and eminent Judges; both embodied in themselves the typical traits of a Judge, learning, clarity, objectivity, fearlessness and humility. For the first time, a marble statue was raised for Justice Muthuswamy Ayyar within the precincts of the Madras High Court. Public, especially the villagers, worship the statue as the deity of justice. They had mutual respect; and I am told that Justice Muthuswamy Ayyar came all the way from Madras to Allahabad to meet him. Really great men do not require statues or portraits. These two gentlemen are shining examples of legal thought and they will be remembered so long the rule of law lasts in our country.

I have no doubt that the portrait I am unveiling today will inspire the future generations of Judges and lawyers alike in discharging their duties by keeping in mind the ideals for which Mr. Justice Mahmood stood and worked.

(Speech delivered on November 27, 1966, on the occasion of unveiling the portrait of Mr. Justice Mahmood)

***

سرسید نے کہا تھا۔۱

- کامیابی کا راستہ۔تاریخی ورثہ کی حفاظت کرو۔کسی قوم کے لئے اس سے زیادہ بے غیرتی نہیں کہ وہ اپنی قومی تاریخ کو بھول جائے اور اپنے بزرگوں کی کمائی کھودے۔(لکچروں کا مجموعہ ص ۱۲۴)
- زمانہ کا ساتھ دو۔خدا کا حکم کوئی تحریری نہیں آتا، مگر زمانہ کے حالات سے پایا جاتا ہے۔(امرتسر ۲۹ جنوری ۱۸۸۴ء لکچروں کا مجموعہ ص ۱۸۴)
- علم کے خزانوں کو اپنے قبضہ میں کرلو۔سب (ترقی) کی جڑ یہی ہے کہ سب سے پہلے علم کے خزانوں کو اپنے قابو میں کرلو۔(بنارس ۲۰ دسمبر ۱۸۶۷ء لکچروں کا مجموعہ ص ۳۸)
- اپنی خامیوں کا احساس پیدا کرو۔دنیا میں کسی قوم کی ترقی کے یہی دو نشان ہیں۔ایک یہ کہ وہ سمجھنے لگیں کہ وہ ذلت اور خرابی میں مبتلا ہیں،اور دوسرا نشان یہ ہے کہ اس ذلت سے نکلنے کی کچھ کوشش شروع کردیں۔(لکچروں کا مجموعہ ص ۲۴۸)
- سچائی اختیار کرو۔انسان کو چاہئے کہ اپنے مخالف سے بھی مخالفت کرنے میں سچائی اور راستبازی' نیک دلی کو کام میں لاوے کہ یہی طریقہ اپنے مخالف پر فتح پانے کا ہے۔ورنہ بعوض اپنے مخالف کے خود اپنے تیئں آپ رسوا کرنا ہے۔(تہذیب الاخلاق ج ۳ ص ۱۹۴)
- اپنی مدد آپ کرو۔یہ ایک نہایت عمدہ اور آزمودہ مقولہ ہے۔اس چھوٹے سے فقرہ میں انسانوں کا اور قوموں کا اور نسلوں کا تجربہ جمع ہے۔ایک شخص میں اپنی مدد آپ کرنے کا جوش اس کی ترقی کی سچی بنیاد ہے۔اور جب کہ یہ جوش بہت سے لوگوں میں پایا جائے تو وہ ترقی اور قومی طاقت اور مضبوطی کی جڑ ہے۔(مقالات سر سیّد/ص/۱۲۴)
- سب مذاہب کا احترام کرو۔ہمارا عقیدہ ہے وہ لوگ جو سچے' پاک باز اور تقویٰ شعار ہیں گو وہ کسی مذہب اور ملت کے کیوں نہ ہوں ویسے ہی تعظیم و تکریم کے مستحق ہیں جیسے کہ خود اپنے ہاں کے بزرگ اور مقدس لوگ۔(خطباتِ احمدیہ)
- فکر و عمل میں یکسانیت پیدا کرو۔میری نصیحت تم سب کو یہ ہے کہ کرو اسکو جس پر تم کو دلی یقین ہے اور مت کرو اسکو جس پر تم یقین نہیں ہے۔یہی اصلی سچائی ہے اور یہی ایک بات ہے جس پر دونوں جہاں کی نیکی منحصر ہے۔(مرزاپور ۳ نومبر سنہ ۱۸۷۳ء (لیکچروں کا مجموعہ ص ۷۷)
- آزادیِ رائے ضروری ہے۔رایوں کا بند رہنا،خواہ بہ سبب کسی مذہبی خوف کے،اور خواہ بہ سبب اندیشۂ برادری کے،اور خواہ بدنامی کے ڈر سے،اور یا گورنمنٹ کے ظلم سے،نہایت ہی بری چیز ہے۔....رایوں کے بند رہنے سے تمام انسانوں کی حق تلفی ہوتی ہے اور کل انسانوں کو نقصان پہنچتا ہے،اور نہ صرف موجودہ انسانوں کو' بلکہ اُنکو بھی جو آئندہ پیدا ہوں گے۔(مقالات سر سیّد۔ ص ۱۵۱)
- خوشامد ایک بیماری ہے۔دل کی جس قدر بیماریاں ہیں اُن میں سب سے زیادہ مہلک خوشامد کا اچھا لگنا ہے۔(مقالات/ص ۱۷۶)
- ''میں تم سے سچی بات کہتا ہوں کہ قومی تعلیم اور قومی عزّت ہم کو اس وقت تک حاصل نہیں ہونے کی،جب تک ہم اپنی تعلیم کا کام خود اپنے ہاتھ میں نہ لیں گے۔گورنمنٹ کی قدرت سے خارج ہے کہ وہ ہمارے تمام مقاصد کی تکمیل کرسکے''۔
- ''جو شخص سچے دل سے اور نیک نیّت سے کسی کام کو کرتا ہے اس کو برا کہنے والوں سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔اس کو خدا سے غرض ہوتی ہے۔اور جب خدا سے غرض ہے تو لوگوں کے برا کہنے سے اس کے دل پر کچھ اثر نہیں ہوتا بلکہ ان لوگوں کے ساتھ اس کی محبت بڑھتی جاتی ہے اور وہ زیادہ کوشش کرنے لگتا ہے۔وہ سمجھتا ہے کہ ان لوگوں کو فائدہ پہنچانے اور سمجھانے کے لئے زیادہ کوشش درکار ہے۔اور جوں جوں مخالفت بڑھتی جاتی ہے،اس کی کوشش بھلائی کے واسطے ترقی کرتی جاتی ہے۔''
- ''میں مسلمانوں کا اسقدر مشکور نہیں ہوں جس قدر ہندوؤں کا ہوں جنھوں نے بطور خیرات کے اپنے بھائیوں کی مدد کی۔مدرسہ (علی گڑھ کالج) کی عمارات کی دیواروں اور محرابوں پر بہت سے ہندوؤں کے نام کندہ ہیں،جس سے ہمیشہ کو یہ یادگار قائم رہے گی کہ ہندوؤں نے اپنے درماندہ مسلمان بھائیوں کی کس فیّاضی سے مدد کی تھی۔''
- ''محبت کے بے شمار درجے ہیں۔ان میں سب سے اعلیٰ اور افضل درجہ یہ ہے کہ تمام موجودات عالم کو ہم حقیقت کی آنکھ سے دیکھیں۔یعنی اگر ہمیں نظر آئے کہ ایک گھانس کے تنکے کو ناحق توڑا گیا ہے تو ہمارے دل میں ایسا درد پیدا ہو کہ گویا ہمارے ہاتھ اور پاوؤں کے ناخنوں میں سے ایک ناخن کاٹ ڈالا گیا ہے۔مگر محبت کا یہ درجہ اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ خداوند عالم اپنی رحمت کا دروازہ کسی پر نہ کھولے''۔سرسید (۱۶ اکتوبر، ۱۸۶۳ء بمقام کلکتہ)

***

Unveiling the portrait of

JUSTICE SYED MAHMOOD

- by Prabodh Gaur
Advocate, High Court Allahabad

SAIYED MAHMOOD has stirred not only his own age but has given inspiration to the ages that have followed. The first Indian Judge of the Allahabad High Court and one of the greatest in the country, he draws the varied lines of law to a point and centres them all to turn the face of jurisprudence to philosophy. To call Mahmood merely an author of erudite judgments would be a poor tribute to ~him. We owe him something much more. He, like his great contemporary Muthusami Aiyar, laid bare the hidden roots of jurisprudence and effected a wholesome critical review of the legal institutions and opinions on Hindu and Mahomedan texts that for centuries had enjoyed acceptation of legal thinkers. Verity is verification; it is the heritage of continually accumulating modifications left to us by those elevators who keep on transforming into light and flame all that they discover in the realm of knowledge. This process of verification is continual, converting our denunciations into approbation and sometimes approbation into censure. Innovators are not merely begetters but liberators as well. They create and also release the reality from the cobwebs of misconceptions. Law being nearer philosophy, its aim should be to equal the perfection of philosophy, to see things in the light of eternity as they may seem for ever. Who can be true to such a purpose and has the vision to see the sublimity in it. Obviously the philosopher in law and Mahmood's name can certainly be written in the serene brotherhood of such philosophers. With a candid and searching mind the flames of which were burning all the cobwebs incarcerating the spirit of jurisprudence, he stands as one of the greatest innovators in the realm of law.

Mahmood, the second son of Sir Saiyed Ahmad Khan, was born in 1850. After being called to the Bar in 1872, he joined the Allahabad High Court Bar and in 1879 he was appointed a District Judge. Having won approbation in several of his judgments in the Privy Council, he was offered a chance to officiate on the Bench at the early age of 32 in 1882. In 1886 he came to this Court as a permanent Judge. Early success is not without its dangers, but remarkably enough his career escaped its spoiling effects. That he could sustain his distinction with unwaning lustre in an age of great contemporaries is indeed a convincing proof of his dynamism. His conquest in the region of law as an explorer had been incessant. There was scarcely any domain which had not been greeted by his expositions. His intellectual independence, faculty of luminous exposition and his deep sensibility of the reason of law enabled him to determine the broad path to legal principles upon which the succeeding generations had been treading to reach their ultimate destination.

The depth of his thought matched by the beauty of his language imparts a rare excellence to his judgments. The fusion of law and equity in his expositions opened new windows of legal concepts, making that visible which hitherto seemed abstruse to the point of invisibility. On the principles of natural justice embodied in the maxim audia alteram partem his judgment in Queen Empress versus Phopi (I. L. R. XIII All. 171) remains unexcelled unto this day. His dissenting judgment in the Full Bench is more truly the reflex of his impartial perception of the objective, the essential and the universal, and he alone had asserted that no man-made law can be permitted to violate the divine injunctions for humanity. In the realm of personal laws of Hindus and Mahomedans the mainsprings of his expositions are the texts. To arrive at correct interpretation of the texts one must seek out its makers in the still sanctuary of their own works and very rightly his first counsel were the creators themselves than the expositors. Not only this, he travelled into the regions left unexplored by the commentators on the texts and his judgments like the sunlight pouring through the clouds revealed many a hidden truth. His judgments in Jafri Begum versus Amir Mohammad (I. L.R. VII All. 1289) and Allahdad Khan versus Ismail (1. L. R. X All. 1289) are indeed startling innovations in Mahomedan Law. On the law of preemption, his exposition in Gobind Dayal versus Inayatullah is classic and his conclusions on the origin of the right of preemption have enjoyed acceptance with unbroken consistency.

His minutes on the draft bill intended to be introduced in the Parliament are not less memorable than his judgments. The bill aimed at the extension of the territorial and other

jurisdictions of the existing High Courts, something intended to be a kind of supplement to statutes 24 and 25 Vie. Cap. Mr. Justice Mahmood in these minutes suggested that the bill should empower Her Majesty to extend the High Courts' jurisdiction to any territory which had either been assigned to the Government of India or over which jurisdiction had been created by native States to the Government of India. In his views on the language in law courts he was far more advanced than his age. In these minutes one finds his words of censure on the practice of dismissal of appeals without any hearing on the meaningless ground of the appellant's failure to deposit the cost of translation and printing of the record into English. His other colleagues on the Bench did not view his suggestions with favour and for a time his proposals sank into the dark unfathomed caves until they were taken out by the succeeding generation of Judges for incorporating them in the Rules of Court. Many of them have found their way into the Rules, and the acceptance of the rest seems a certainty in the not distant future.

From the Bench he retired in 1893 and perhaps his early retirement was a price that he had to pay for his independence. The subsequent stages of his performance were the Legislative Council and the Bar of the Judicial Commissioner's Court, Oudh, but his laurels there are too few or perhaps none to be recounted. Looking back to his brilliant past, one finds their rays rather dim. For some time he was the Secretary of the M. A. O. College, Aligarh, the service of which was the legacy left to him by his father.

The thinkers and the innovators are always the enemies of the mob. This is the truth of history, nay that of eternity and from this rule of eternity Mahmood could not escape. He may have been refuted by his contemporaries and aspirants to legal fame, yet he stands as a distinct milestone in legal thought. The air of legal philosophy became clearer and fresher because of his expositions. The modern thinkers in law may find in his expositions an opening for objection and doubt, nevertheless, there is no escape from the truth that few Judges have given so many shores and lighthouses to the dark ocean of law as he.

The total picture of his life is rather painful and gloomy; nevertheless it is a reality the romance of which no fiction can match. A great intellectual energy completely burnt and extinct withered slowly into a childlike senility that came at last. His race had been run, his course was over and his battles fought; one by one his sensibilities and powers had left him. On 8th May, 1903, he passed on to the Gods quietly like a leaf falling from the tree.

Amongst the record of the memorable dead hangs the portrait of Mahmood with veneration gathered round it and we see some invisible finger inscribing on it:

"Look here, upon this picture and on this."

***

سرسید نے کہا تھا۔۲

- ”ایک مدت دراز سے ہماری قوم کی ترقی مثل ایک ایسی بند جھیل کے ہوگئی تھی جس کا نہ کوئی پانی بہتا ہو اور نہ اس میں کوئی حرکت ہو اور نہ اس میں کسی اور طرف سے پانی آتا ہو، تند ہوا کے جھونکوں اور آفتاب کی گرمی سے اس کا پانی روز بروز خشک ہو جاتا ہو۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ کہ چند سال سے اس بند پانی میں کچھ حرکت آئی ہے۔ تمام ممالک میں، کیا بنگلہ، کیا ہندوستانی، کیا پنجاب، کیا دکن، سب کی زبان پر، سب کے قلم پر، یہ بات جاری ہے کہ قوم کی حالت خراب ہے، وہ روز بروز تنزّل کرتے جاتے ہیں۔ ان کو کچھ کرنا چاہئے۔ وہ لوگ صرف کہنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ کچھ کچھ کرتے بھی جاتے ہیں۔ جا بجا انجمنیں قائم ہوتی ہیں۔ اخباروں میں آرٹیکل لکھے جاتے ہیں مدرسہ اور اسکول بناتے ہیں۔ یہ نہایت عمدہ نشانیاں ہیں۔ جس قوم کو یہ خیال ہوا کہ ہم تنزل کی حالت میں ہیں اور اس کے ساتھ اس میں کچھ تحریک بھی پیدا ہوئی تو پہلی سیڑھی ترقی کی ہے۔ ایسی حالت میں یہ امر بھی لازمی ہے کہ ترقی کرنے والوں کے خیالات مختلف ہوتے ہیں۔ کوئی کچھ کرنے لگتا ہے، کوئی کچھ۔ اپنی قوتوں کو بغرض اس کے کہ ایک جگہ جمع کردیں، پریشان کرنے والے ہیں۔ جو کام اصلی ہے، اس کو چھوڑ دیتے ہیں اور جو اس کی طرح ہے اس کو اختیار کرتے ہیں جس کے سبب سے کسی میں بھی کامیابی نہیں ہوتی۔ اس زمانہ میں یہی حال ہماری قوم کا ہے۔ مگر پانی کا خاصہ ہے کہ جب وہ بہتا ہے تو چاروں طرف پھیلتا ہے، پھر رفتہ رفتہ جو ٹھیک راستہ ہو اس کو اختیار کرلیتا ہے۔ اس لیے ہم کو اپنی قوم سے امید ہے کہ رفتہ رفتہ وہ بھی ٹھیک راستہ قومی ترقی کا پائے گی اور تمام مختلف خیالات ایک اصلی مرکز کی طرف جمع ہوں گے۔“(لکچر بمقام لدھیانہ، ۲۱ جنوری ۱۸۸۴ء)
- ”مجھ کو یقین ہے کہ میری زندگی میں عام مسلمانوں کی گالیوں اور نفرت سے مجھ کو نجات نہ ملے گی۔ عیسائی بھی میری تفسیر سے خوش نہیں ہو سکتے، کیونکہ جس طرح میں انجیل کی تعلیم صحیح اور درست سمجھتا ہوں اسی طرح تثلیث کے مسئلہ کا قائل نہیں ہوں۔ مجھ کو یقین ہے کہ مذہب اسلام صحیح ہے۔ اس لیے مجھے کچھ پرواہ نہیں کہ میں کسی گروہ کے لوگوں کو خواہ وہ مسلمان ہوں یا عیسائی خوش کروں۔ میں حق پر ہوں اور اس خدا کو خوش کرنا چاہتا ہوں جس کے روبرو سب کو ایک دن جانا ہے۔“
- ”انگریزوں نے مسلمان بادشاہوں اور مسلمان حکومتوں کی تاریخیں نہایت ناانصافی اور تعصب سے لکھی ہیں اور کوئی برائی نہیں ہے، جو مسلمانوں کی طرف منسوب نہ کی ہو۔ ہماری قوم کے جوان لڑکے انگریزی میں انہیں تاریخوں کو پڑھتے ہیں اور دیکھتے ہیں جس سے برا نقص پیدا ہوتا ہے۔ اور جو بات کہ ازراہِ ناانصافی اور تعصب کے مسلمانوں کی نسبت لکھی گئی ہے اس کو وہ سچ اور واقعی سمجھتے ہیں۔ اس لیے اسی قسم کی انگریزی کتابوں کا پیدا ہونا، جن میں مسلمانوں کا حال نہایت سچائی اور انصاف سے لکھا گیا ہو، نہایت مفید بلکہ نہایت ضروری ہے۔“(لندن سے محسن الملک کے نام ایک خط میں)

***